یک زمانے صحبتے با اولیاء

تذکرہ

عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ

(ولادت: ۱۱/ شوال المکرم ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۹۲۳ء—وفات: ۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸/ اگست ۱۹۹۷ء)

اختر امام عادل قاسمی

دائرۃ المعارف الربانیۃ

جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:- تذکرہ عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ

مصنف:- مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

صفحات:- ۴۰

سن اشاعت:- ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۰۲۳ء

ناشر:- دائرۃ المعارف الربانیۃ جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

قیمت: ۷۵روپے

ملنے کے پتے

☆مرکزی مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف، پوسٹ سوہما، ضلع سمستی پور بہار 848207 موبائل نمبر:9473136822

☆مکتبہ الامام، سی 212، امام عادل منزل، گراؤنڈ فلور، شاہین باغ، ابو الفضل پارٹ ۲، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی 25 موبائل نمبر: 9934082422

فہرست مندرجات

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱	چند گھنٹے بھوپال میں	۶
۲	دہلی مرحوم کا خیال	۷
۳	آج کوئی میر سنہیں	۸
۴	مسجدوں کا شہر	۸
۵	ترجمہ والی مسجد	۹
۶	بھوپال کی سیر	۱۰
۷	تاج المساجد	۱۰
۸	بھوپال کا وسیع اور تاریخی ساگر	۱۲
۹	باندہ-قدر افزائی کی منزل	۱۲
۱۰	قدر افزائی کا فلسفہ	۱۳
۱۱	خوبیوں کا پیکر-ایک مرد درویش	۱۳
۱۲	علاقہ کے حالات	۱۴
۱۳	جامعہ عربیہ کی ایک جھلک	۱۴
۱۴	حیرت انگیز انقلاب	۱۶
۱۵	عہد رفتہ کا منظر نامہ	۱۶
۱۶	خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا	۱۷
۱۷	جامعہ کے اندر	۱۸
۱۸	حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی	۱۸
۱۹	حضرت باندویؒ کی مجلس درس میں	۱۹

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۲۰	شدید حساسیت	۱۹
۲۱	اکابر کی شہادتیں	۲۰
۲۲	بیت الخلا کی صفائی	۲۰
۲۳	ایثار کی شاندار مثال	۲۱
۲۴	غم کے موقعہ پر دوسروں کا خیال	۲۲
۲۵	کسی محرم اسرار کی صحبت بھی ضروری ہے	۲۳
۲۶	صدیق تو صدیق ہے	۲۳
۲۷	موت سے پہلے آرام نہیں	۲۴
۲۸	ہماری باری	۲۵
۲۹	تعویذ کا راز	۲۵
۳۰	مفتی محمد زید مظاہری	۲۶
۳۱	یہ راستہ بڑے مجاہدے کا ہے	۲۶
۳۲	قاری صاحبؒ کی فراست ایمانی کا ذاتی تجربہ	۲۷
۳۳	نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات	۲۸
۳۴	دین کے معاملے میں کسی کا خوف نہیں	۲۹
۳۵	ایک تازہ تصنیف کا مسودہ دیکھنے کا اعزاز	۳۰
۳۶	مروجہ دفتری نظام کا فقدان	۳۱
۳۷	نصف صدی قبل کا ایک طالب علم	۳۱
۳۸	جامعہ کا مارکیٹ	۳۳

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۳۹	مولوی گنج	۳۳
۴۰	حضرت باندویؒ کا آبائی مکان	۳۳
۴۱	جامعہ عربیہ کا نقطۂ آغاز	۳۴
۴۲	مولانا مرحومؒ	۳۴
۴۳	حضرت باندویؒ بحیثیت شاعر	۳۶
۴۴	لمحۂ واپسی	۴۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دار العلوم حیدرآباد میں مدرس تھا، ۱۶/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ ہجری کو دارالعلوم کا امتحان ششماہی ختم ہوا اور ہم ایک سفر پر روانہ ہو گئے، اس سفر میں میرے ساتھ جناب مولانا قمر الہدیٰ صاحب بھاگلپوری، حافظ شہاب الدین صاحب سلطانپوری اور جناب مولانا نور الدین صاحب اعظمی شامل تھے۔

چند گھنٹے بھوپال میں

ہماری پہلی منزل بھوپال تھی، قاضی وجدی الحسینیؒ کا شہر، نواب صدیق حسن خانؒ کی سرزمین، مگر یہ منزل محض سرسری تھی، اس کو منزل کے بجائے ہمارے اس سفر کا اکسٹینشن ہاوس کہنا زیادہ مناسب ہو گا، دکن اکسپریس کو بھوپال میں اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہاں سے دوسری ٹرین "تلسی اکسپریس" سے ہمیں باندہ جانا تھا، ان دونوں ٹرینوں کا درمیانی وقفہ چند گھنٹوں کا تھا، ان چند گھنٹوں کے لئے بھوپال ہماری منزل تھی، مگر یہ چند گھنٹے ہمارے اس سفر میں کافی اہمیت رکھتے ہیں، ایک تاریخی سرزمین، عہد ماضی کی ایک شاندار اسلامی ریاست، نوابوں اور رئیسوں کا مسکن و مدفن، اپنے وقت میں علماء اور دانشوروں کا مرکز، مسجدوں کا شہر، دعوت و تبلیغ اور علم و فن کا مستقر۔۔۔۔ اور خاص بات یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے پورے ہندوستان کا دل، بھوپال مدھیہ پردیش کا دارالحکومت ہے، مدھیہ کے معنی بیچ کے آتے ہیں، یعنی جغرافیائی طور پر یہ علاقہ پورے ہندوستان کا سینٹر ہے۔

نہ معلوم بہار اور دلی سے حیدرآباد جاتے ہوئے کتنی بار اس شہر کے اسٹیشن سے گذرنا ہوا تھا، مگر زندگی کے تیز رفتار سفر میں کسی آئے ہوئے لمحے کی طرح یہ گذر گیا تھا، اور اس کی یادوں کے نقوش شام کے دھندلکے میں گم ہوتے ہوئے نقطے کی طرح کھو گئے تھے، کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا کہ اس قلب ہندوستان پر کچھ دیر رک کر اس کی دھڑکنیں سنوں، اس کے تاریخی کھنڈرات سے اس کے احوال معلوم کروں، اس خاک کے ذروں سے عہد ماضی کا اجالا مانگوں اور شہر خموشاں کی دیواروں پر اس کے عہد درخشاں کی تاریخ پڑھوں۔

آج یہ حسین اتفاق میرے سامنے تھا، تو میرا سر شرم سے جھکا جارہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس شہر کے ذروں نے اٹھ کر مجھ سے پوچھ لیا:

جیتے جی بات نہ پوچھی میری
اب پس مرگ مرا ماتم کیا ہے

تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟، میں کہہ سکتا تھا کہ تمہارے جینے کے دور میں میں خود موجود نہیں تھا، دم مرگ بھی میں نہیں تھا، میرا وجود ہی پس مرگ ہوا ہے، تو میرے حصے میں ماتم کے سوا کیا آئے گا؟۔۔۔ لیکن کسی ویران کھنڈر سے کون بات کرے؟ رونے اور سسکنے والے سے کون حجت کرے؟، اور غم زدہ ماحول میں تنقید و تردید کا زہر کون گھولے؟ یہ تو دلاسے کا وقت ہے، بحث و مباحثہ کا نہیں، یہ غم میں شرکت کا موقعہ ہے، اس سے فرار کا نہیں، اور یہ زخم پر مرہم رکھنے کا وقت ہے، اس پر نمک چھڑکنے کا نہیں۔

دہلی مرحوم کا خیال

میں جب اسٹیشن سے نکل کر شہر میں داخل ہو رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ جب دلی ویران ہوئی تھی، اور میر تقی میرؔ اس کو چھوڑ کر لکھنؤ پہونچے تھے اور وہاں ایک مشاعرے کی محفل گرم تھی جس میں میرؔ کی پہلی بار شرکت ہوئی، تو ان کی وضع قطع اور لباس کو دیکھ کر لکھنؤ کے کچھ منچلوں نے مذاق کیا اور بعض پوچھ بیٹھے کہ جناب کا وطن کہاں ہے؟ اس موقعہ پر میرؔ کو اپنا اجڑا ہوا وطن شدت سے یاد آیا تھا، اور احساس کی اسی تمازت نے ان سے برجستہ یہ بیش قیمت اشعار کہلوائے تھے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
مجھ کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے جہاں منتخب ہی روز گار کے

اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

آج کوئی میر نہیں

کل کا شاندار بھوپال آج اجڑی ہوئی حالت میں میرے سامنے تھا، تو میں کس میر کو پکارتا، جو اس اجڑے ہوئے بھوپال کی تصویر کھینچے اور اس کے درد و کرب کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالے، آج کوئی میر بھی موجود نہیں تھا، آہ! آج کوئی نہیں ہے۔

اقبال نے سچ کہا تھا:

اقبال اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد ہاں ہمارا

میں اسی کرب اور اسی احساس محرومی کو لئے آگے بڑھنے لگا تو اس شہر کے ماضی و حال نے میرا دامن پکڑ لیا اور ساز و سوز سے معمور ملے جلے ماحول نے ظہیر غازی پوری کے الفاظ میں خود اپنی تصویر درد اتاری، جس میں کرب کے ساتھ حیرت و خودی کے عناصر بھی شامل تھے:

ایک ویران خلا ہے مجھ میں — پھر بھی کیوں شور بپا ہے مجھ میں
روح زخمی سی ہے میری شاید — آئینہ ٹوٹ گیا ہے مجھ میں
ریت ہی ریت ہے بکھری ہر سو — دشت بن کر وہ بسا ہے مجھ میں
مختلف شکلوں میں کوئی پیکر — عہد تا عہد رہا ہے مجھ میں
وقت نے لوٹ لی ساری پونجی — اک مرا "میں" ہی بچا ہے مجھ میں

مسجدوں کا شہر

یہ چند گھنٹے گذارنے کے لئے ہمیں کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی، موسم برسات کی فیاضی شروع ہو چکی تھی، موسلا دھار بارش میں پورا شہر نہا رہا تھا، ہم بھی بھیگتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلے، بڑی مشکل سے ایک آٹو رکشہ ملا، اور ہم ترجمہ والی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے، بھوپال میں مسجدوں کی کمی نہیں ہے، قریب پانچ سو (۵۰۰) تاریخی مسجدیں وہاں پائی جاتی ہیں، کسی ایک شہر میں اتنی زیادہ تاریخی مسجدوں کا ہونا ایک نادر بات ہے، لیکن ان تمام مسجدوں میں "ترجمہ والی مسجد" اور "تاج المساجد" کو خاص شہرت حاصل ہے، ان دونوں مسجدوں میں دو بڑے مدرسے چل رہے ہیں ترجمہ والی مسجد پر دیوبند کی چھاپ ہے تو تاج المساجد پر ندوہ کی۔

ترجمہ والی مسجد

ترجمہ والی مسجد اپنی شہرت کے مقابلے میں خاصی چھوٹی مسجد ہے، مسجد کے اطراف میں مدرسہ کی پُر شکوہ عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، لیکن مسجد کا حصہ بالکل سادہ اور مختصر ہے، ہم لوگ جس دن وہاں پہونچے وہ جمعہ کا دن تھا، مدرسہ میں ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی، ہم سر براہ ادارہ حضرت مولانا مفتی عبد الرزاق صاحبؒ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے، مگر وہ ایک سفر پر تھے، وہاں کئی علماء اور احباب سے ملاقاتیں ہوئی، جو غائبانہ طور پر مجھ سے واقف تھے، ادارہ کے لائق و فائق استاذ مولانا مفتی ابو الکلام صاحب قاسمی زید مجدہم میرے خاص شناشاؤں میں ہیں، وہ مدرسہ میں موجود نہ تھے، اطلاع ملنے پر تشریف لائے، اور خوشگوار خیر مقدم کیا، مختصر ترین وقت اور وہ بھی سخت برسات میں انہوں نے ہمارے لئے وہ انتظامات کئے جو ان کی خوش اخلاقی کے مظہر تھے، ان کی علمی لیاقت، قلمی صلاحیت، تقریری مہارت، فکری بالغیت اور اور فطری صالحیت سے تو میں پہلے ہی واقف تھا، وہ ترجمہ والی مسجد سے نکلنے والے رسالہ "دین مبین" کے ایڈیٹر ہیں، وہاں کے شعبۂ افتاء کی روح اور جان ہیں، ملک کی مؤقر علمی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے ہیں، مقالے پڑھتے ہیں اور اظہار رائے کرتے ہیں، میری ان سے ملاقاتیں ایسی ہی کانفرنسوں اور سمیناروں میں ہوئی تھیں، لیکن وہاں پہونچ کر ان کی شخصیت کے کئی مخفی جوہر سامنے آئے، میں ان کی خوش اخلاقی، حسن انتظام، وقت شناسی اور اثر و رسوخ

سے بہت متاثر ہوا، انہوں نے اولاً ہمیں روکنے کی کوشش کی، اور کہا جب آپ اس تاریخی شہر میں آگئے ہیں، تو اس کی بساط پر پھیلے ہوئے آثار و شواہد بھی دیکھتے جایئے، مگر ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ ہم حضرت باندویؒ کو اپنی آمد کی اطلاع دے چکے تھے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شہر بھوپال میں ہماری اتنی پذیرائی ہوگی ورنہ ایک آدھ دن اس کے لئے بھی گنجائش نکال کر آتے، ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ مفتی صاحب سے معذرت کی۔

بھوپال کی سیر

مفتی صاحب نے اس کے متبادل کے طور پر شہر بھوپال کی سرسری سیر کی تجویز پیش کی، جس کو ہم لوگوں نے بخوشی قبول کیا، مدرسہ کی ایک جیپ اس بھری برسات میں جب کہ گاڑی کے شیشے سے چند قدم کا فاصلہ بھی بمشکل نظر آتا تھا، شہر کی طرف نکل پڑی، ہماری گاڑی کے ہر چہار طرف برسات کی سفید دھند پھیلی ہوئی تھی، سڑکوں پر ایک فٹ اوپر پانی بہہ رہا تھا، ہوا خاموش تھی، برسات کی ٹھنڈی اور پرشور لہریں میرے تحت الشعور میں تموج پیدا کر رہی تھیں، ہمیں اپنے ارد گرد کچھ نظر نہیں آرہا تھا ، مفتی ابوالکلام صاحب ہم لوگوں کو تاریخی اور مشہور مقامات دکھانے کی کوشش کر رہے تھے، ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر دیکھتے اور جو بھی دھندلا عکس ملتا اسی کو حاصل سیر و سفر سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ۔۔۔ کئی تاریخی مسجدوں پر ہمیں لے جایا گیا، لیکن ہم کسی کو اندر سے نہ دیکھ سکے، بس باہر ہی سے ان کے بلند گنبدوں اور میناروں کو جھک کر سلام کر لیا، ان کی عظمتوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور آگے بڑھ گئے

تاج المساجد

البتہ تاج المساجد کو اندر سے دیکھنے کا موقعہ ملا شہر کی سب سے عظیم الشان مسجد یہی ہے، بلکہ صحن اور مسجد کے مضافاتی حصے کی وسعت کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد مانی جاتی ہے۔ اس مسجد کی بنیاد نواب شاہ جہاں بیگم والی بھوپال نے ڈالی تھی اور ایک بہت کشادہ مسجد بنانے کا عزم کیا تھا، اس کے لئے نامی گرامی انجنیئر بلائے گئے تھے، لیکن یہ مسجد ان کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہونچ سکی، اس مسجد کی لمبائی ۸۶ گز ہے، اور چوڑائی ۲۱ گز، پوری مسجد سنگ سرخ سے بنائی گئی ہے، اپنی زندگی میں شاہ

جہاں بیگم اس کی تعمیر پر بیس (۲۰) لاکھ روپے خرچ کر چکی تھیں، اس کے لئے باہر سے عمدہ قیمتی پتھر منگوائے گئے تھے، اس مسجد کے ستون پتھروں کو تراش کر نکالے گئے تھے، پھر ان پر نقش و نگار بنائے گئے، اس کی تکمیل کے لئے ایک اطالوی انجنیئر بلوار کھا تھا، یہ مسجد شہر کے کنارے واقع تھی اب تو شہر میں آگئی ہے۔

اس مسجد کا اندرونی احاطہ تین سو پچیس (۳۲۵) فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے، اس مسجد کے محرابوں اور اس کے پایوں اور ستونوں کی بلندی ۷۴ فٹ سے لے کر ۱۷۰ فٹ تک ہے، اس مسجد کی تزئین کے لئے شاہ جہاں بیگم نے بہت سارے حسین و دیدہ زیب جھاڑ فانوس فراہم کر رکھے تھے کہ تیاری کے بعد لٹکائے جائیں گے، ان کی حکمرانی ۱۸۶۸ء سے ۱۹۰۱ء تک رہی، ۱۹۰۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا

بیگم صاحبہ کے بعد خاندان کے دوسرے مستحق افراد حکمراں ہوئے، ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور پھر اس کے کچھ سالوں کے اندر ملک کی ساری ریاستیں قانوناً ختم کر دی گئیں اور حکومت ہند کے تحت آگئیں، نوابوں اور مہاراجوں کی حکومت ختم ہو گئی، وہ تمام عام رعایا کے درجے میں آگئے اور سیاسی رہنما ملک کی قسمت کے مالک بن گئے۔

آزاد ہندوستان میں مولانا عمران خان ندویؒ نے تاج المساجد کو آباد کرنے کے لئے حکومت کی اجازت سے دارالعلوم تاج المساجد کے نام سے ایک عربی دینی مدرسہ قائم کر دیا، جس کا پہلا افتتاحی اجلاس حضرت العلامہ سید سلیمان ندویؒ قاضی القضاۃ کی صدارت میں منعقد ہوا، جو آزادئ ملک کے وقت قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔

مولانا عمران خان ندوی نے مسلمانوں کے عام چندوں اور اپنی جد وجہد سے اس مسجد کی تکمیل فرمائی اور دارالعلوم کی بدولت یہ مسجد آباد اور پر رونق ہو گئی، مولانا کی توجہ ہی سے وہاں ہر سال تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع شروع ہوا، جس میں لاکھوں کی تعداد میں عوام و خواص جمع ہوتے ہیں، یہ سالانہ اجتماع اپنے روایتی شان و شکوہ کے ساتھ تاہنوز جاری ہے۔

اب اس مسجد کے ارد گرد طلبہ و اساتذہ کے قیام کے لئے کمرے بھی بڑی تعداد میں بن گئے

ہیں[1]۔ یہاں کسی ذمہ دار سے ملاقات نہ ہو سکی، بارش کی شدت کی وجہ سے تمام کمروں کے دروازے بند تھے، ہمارے پاس وقت کم تھا، اس لئے ان دروازوں کے کھلنے کا انتظار نہ کر سکے۔

بھوپال کا وسیع اور تاریخی ساگر

اس کے بعد ہم ایک وسیع و عریض ساگر پر بھی پہونچے، جس کے کنارے خوبصورت عمارتوں کے علاوہ ایک درجن سے اوپر مسجدیں تھیں، میں نے کسی ساگر کے کنارے اتنی زیادہ مسجدیں پہلی بار دیکھیں۔۔۔۔۔ میرے سامنے حیدرآباد کا وسیع و عریض "حسین ساگر" تھا اور میرا خیال تھا کہ اتنا بڑا ساگر وسط شہر میں شاید کسی دوسرے شہر میں نہ ہو، لیکن بھوپال کے اس ساگر پر پہونچ کر میرا خیال غلط ثابت ہوا، یہ غالباً حسین ساگر سے بھی بڑا ساگر تھا۔

واپسی پر ہم تھوڑی دیر ترجمہ والی مسجد میں ٹھہرے، رات کے کھانے کا اہتمام مفتی صاحب نے کیا تھا، اس کے لئے ہمیں ان کے دولت کدے پر حاضری دینی تھی، مفتی صاحب نے اپنے دستر خوان پر بھوپالی تہذیب کے شاندار نمونے جمع کر رکھے تھے، ہم ان کے خلوص و محبت سے کافی متاثر ہوئے، ہماری ٹرین کا وقت قریب تھا، اس لئے وہاں سے سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے، بارش کی شدت میں اس وقت کمی آگئی تھی، اس لئے ہمیں اسٹیشن پہنچنے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

باندہ- قدر افزائی کی منزل

اب ہماری منزل بدیل کھنڈ کا علاقہ تھا، اسی علاقہ میں باندہ ضلع پڑتا ہے، صبح فجر کی نماز کے باندہ اسٹیشن آگیا، اسٹیشن سے باہر نکلے تو دو تین صاحبان سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ ان کو حضرت باندویؒ نے ہمیں لانے کے لئے بھیجا ہے، ہتھوڑا مدرسہ کی جیپ لے کر وہ آئے تھے، میں حیران رہ گیا کہ ہم اتنے معمولی آدمیوں کی اتنی قدر افزائی، میں سوچنے لگا، جس شخص کے دل میں عام لوگوں کی اتنی قدر ہے، وہ خاص لوگوں کی کتنی قدر کرتا ہوگا، دوسروں کی قدر افزائی ان کی بے نفسی اور عاجزی کی علامت

---

[1]- تاریخ مساجد ج ا ص ۲۵۲، مفتی محمد ظفیر الدین صاحب

تھی۔

قدر افزائی کا فلسفہ

کسی کی قدر افزائی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قدر افزائی کرنے والا اپنے کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے دوسرے کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے، جب کہ ناقدری کرنے والا دوسرے کے بالمقابل اپنے آپ کو سب کچھ سمجھتا ہے، ناقدری کرنے والا ہر طرح کے اعزاز واکرام کا حقدار صرف اپنی ذات کو سمجھتا ہے ،جب کہ قدر افزائی کے جذبے سے مالا مال شخص اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے، ناقدری کا جذبہ احساس کمتری و محرومی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، جب کہ قدر شناسی کی بنیاد پختہ اور صحتمند احساس پر ہوتی ہے، قدر افزائی انسان کی عرفان ذات کی علامت ہوتی ہے، جب کہ ناقدری کرنے والا شخص اس نعمت سے محروم ہوتا ہے، ایک عارف باللہ نے ہم کمتریوں کے ساتھ یہ ذرہ نوازی کی تھی، تو اس میں ہماری خوبی نہیں بلکہ یہ خود ان کے عرفان ذات کا کمال تھا۔۔۔ ہم باندہ سے ہتھوڑا تک سر کے بل جاتے تب بھی ہمارے جذبۂ احسان مندی کی تسکین نہ ہوتی۔

سنبھل کر رکھ قدم اے چلنے والے کوئے جاناں میں
یہاں کا ذرہ ذرہ آسمان معلوم ہوتا ہے

خوبیوں کا پیکر-ایک مرد درویش

باندہ سے ہتھوڑا جانے والی سڑک ایک ایسے مرد درویش کے آستانے تک جاتی تھی، جس نے ساری دنیا کو محبت و تعمیر کا درس دیا، جس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، جس نے اپنی تمام عمر عزیز قوم وملت پر نچھاور کر دی، وہ مرد قلندر جس نے اپنے یہاں شاہ و گدا کی تمیز اٹھادی تھی، جس نے بڑی بڑی طاقتوں کے سامنے زیر ہونا گوارا نہ کیا، جس کے جمال میں بھی رنگ جلال تھا، جس کی بے نفسی وسادگی پر ہزاروں شاہانہ سطوتیں قربان تھیں، جو ایک طرف کلبۂ خانقاہی میں گوشہ نشیں ہزاروں تشنگان فیض کو روحانیت سے فیضیاب کر رہا تھا، تو دوسری طرف مسند درس پر جلوہ افروز علم و معرفت کے

موتی لٹا رہا تھا، وہیں تیسری جانب ان کی دعاؤں اور تعویذات سے عام لوگ بھی مستفید ہو رہے تھے، جو درس کے وقت بہترین مدرس، تصنیف و تالیف کے وقت بالغ نظر مصنف، مسند خانقاہی پر شیخ کامل، وعظ و تقریر کے اسٹیج پر بااثر خطیب، اور تعویذوں کی تقسیم کے وقت قوم کے سچے مسیحا تھے۔

آج میری خوش بختی مجھے ایسی بارگاہ میں پہونچا رہی تھی تو چلنے کے لئے میرے پاس خم و ابرو نہیں تھے، تھے تو سب کچھ مگر ان کے استعمال کا موقعہ نہیں تھا، خود صاحب بارگاہ نے اس موقعہ سے ہمیں محروم کر دیا تھا۔۔۔

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

علاقہ کے حالات

کہتے ہیں کہ پہلے یہ علاقہ بہت پسماندہ تھا، آمد و رفت کی بھی سخت دشواری تھی، راستے بھی مامون نہیں تھے، لوٹ مار کے واقعات بھی رونما ہوتے رہتے تھے، ابتداء میں باندہ سے ہتھوڑا تک اٹھارہ (۱۸) کلو میٹر کا سفر پیدل طے کیا جاتا تھا، بعد میں "نو میل" تک آمد و رفت کی آسانی ہو گئی، روڈ بن گیا، اور گاڑیاں چلنے لگیں، لیکن نو میل سے اتر کر ہتھوڑا جانے کے لئے پھر بھی دو کلو میٹر پیدل چلنا پڑتا تھا، راستہ میں ہتھوڑا سے قبل ایک چھوٹی سے نہر پڑتی ہے، اس کی وجہ سے بھی کافی دشواری ہوتی تھی، حضرت باندویؒ کے فیض سے "نو میل" سے ہتھوڑا تک کا راستہ بھی پختہ بنا اور نہر پر پل بھی تیار ہوا، آج کل باندہ سے ہتھورا صبح سے شام تک دو بار بس جاتی ہے، اور دو بار آتی ہے[2]، برسوں کے بعد سہولت اس معیار تک پہونچی ہے، تو ماضی میں کیا حال رہا ہو گا، اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

جامعہ عربیہ کی ایک جھلک

ہماری گاڑی ہتھورا سے کچھ فاصلہ پر تھی کہ مدرسہ کی پُر شکوہ عمارت دور سے ہی جھلکنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کلبۂ درویشی ہے یا محل شاہی، مدرسہ کی شاندار عمارتیں میرے تصور سے بھی زیادہ

---

[2]- یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ تحریر لکھی گئی تھی، امید ہے کہ اب مزید سہولتیں پیدا ہوئی ہونگی۔

وسیع اور خوبصورت تھیں، ایک چھوٹے سے گاؤں میں اتنی غیر معمولی عمارتیں حیرت انگیز تھیں، بالکل سچ کہا تھا مدرسہ مظاہر العلوم جدید سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ نے کہ:

"جسے حضرت قاری صدیق احمد صاحب کی کرامت دیکھنی ہو وہ جامعہ عربیہ ہتھورا کی عمارت دیکھ لے، وہ حضرت کی زندہ کرامت ہے"[3]

کرامت تو حیرت انگیز ہوتی ہی ہے، میرے سامنے ایک زندہ کرامت تھی، اور میں حیرتوں میں غرق پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان عمارتوں کو دیکھ رہا تھا، جس کی ایک ایک اینٹ پر صدق وصفا کی کتنی داستانیں درج تھیں، میں تو آج پہونچا تھا، مجھے حیرت کیوں نہ ہوتی، یہ تو وہ مدرسہ ہے جس نے آج سے تقریباً پینتیس (۳۵) سال قبل مشہور صاحب قلم حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا، اور وہ لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ:

"مدرسہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی، مقام اتنا چھوٹا اور مدرسہ اتنا بڑا، ماشاء اللہ و بارک اللہ، اسلام کے قلعے کہاں کہاں اور کیسے کیسے قائم ہیں"[4]

اور یہی وہ عمارت ہے جس نے ۱۳۹۶ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے دانائے قوم سے ان الفاظ میں خراج تحسین وصول کیا تھا کہ:

"آج بتاریخ ۷ / جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ جامعہ عربیہ ہتھورا میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، چند سال پہلے حاضری ہوئی تھی، تو یہ جامعہ چند کوٹھریوں میں تھا، اور آج وہ ایک طویل وعریض دیدہ زیب عمارت کی صورت میں سامنے ہے، یہ سب کچھ اللہ کے ایک مخلص بندے کے اخلاص وبے لوثی اور حسن نیت کا ثمرہ ہے"[5]

جنگل میں منگل کا سماں تھا، ایسے اجڑے اور پسماندہ علاقے میں اسلام کا اتنا شاندار قلعہ، اتنی

---

[3]- ندائے دار العلوم ۱۵ / اکتوبر ۱۹۹۷ء

[4]- تعمیر حیات ۲۵ / اکتوبر ۱۹۹۷ء

[5]- تعمیر حیات ۲۵ / اکتوبر ۱۹۹۷ء

بڑی تعداد میں علماء اور طلبا کا وہاں قیام، اس سناٹے میں ایسی چہل پہل، یقیناً یہ سب اللہ کے ایک مخلص بندے کے اخلاص و بے لوثی اور حسن نیت ہی کا ثمرہ تھا۔

حیرت انگیز انقلاب

وہ علاقہ جہاں کے باشندے علماء اور مشائخ کو صرف دعا اور تعویذ کا وسیلہ جانتے ہوں، اور جو بزرگوں کو اپنی پست ذہنیت کے اسی آئینے میں دیکھتے ہوں، اسی علاقے میں قال اللہ و قال الرسول کی فضا پیدا ہو جانا، دین کی اعلی تعلیم کے لئے پورے ملک سے طالبان علوم نبوت کا رجوع ہو جانا، بڑے بڑے وزیروں اور متکبروں کا عاجزانہ اور مؤدبانہ وہاں حاضری دینا اور ملک و بیرون ملک کے اکابر علماء و مشائخ کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

عہد رفتہ کا منظر نامہ

آج ہم سب کچھ بنی بنائی شکل میں دیکھ رہے ہیں، اس لئے ہمیں اس کی غیر معمولی اہمیت کا احساس نہیں ہے، لیکن ہم ذرا اس دور اور اس منظر کو ذہن میں رکھیں جب یہاں ہو کا عالم رہا ہو گا، دین اور علم دین کا کوئی ذکر نہ ہو گا، اسی علاقے میں پیدا ہونے والا ایک انسان باندہ سے ہتھورا اور ہتھورا سے باندہ پیدل بھاگ دوڑ کر رہا ہو گا، کچے پکے راستوں پر ندی نالوں کو عبور کرتا ہوا نکل رہا ہو گا، اس کے صاف ستھرے کپڑوں کو نالوں کے مٹیالے پانی گدلا کر رہے ہوں گے، جب ارتداد کی وبا پھیل رہی ہو گی، جب خود مسلمان اسلام کی آغوش سے بھاگ بھاگ کر کفر و ارتداد کی آگ میں کود رہے ہوں گے، جب حضرت قاری صدیق احمد صاحب کا عہد شباب رہا ہو گا، دوڑ دوڑ کر لوگوں سے مل رہے ہوں گے، ان کو دین اسلام کی باتیں سمجھا کر ارتداد سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں گے ۔۔۔۔ وہ قت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب قاری صدیق احمد صاحب کسی کھلیان یا کھیت کی میڑھ پر رات گذار رہے ہوں گے، ان کے چہار طرف غنڈے، لفنگے اور وحشی جانور گھوم رہے ہوں گے، مگر سب سے بے نیاز اللہ کا یہ مخلص بندہ سو رہا ہو گا، ۔۔۔۔ اس منظر کو بھی ذہن میں تازہ کریں، جب فتحپور کے مدرسہ سے مستعفی ہو کر وہ نکلے ہوں گے، اور ایک درد نے ان کو بے در، بے گھر اور بے آستاں کر دیا ہو گا۔

وہ منظر بھی کتنا کربناک ہو گا جب حضرت قاری صاحب نے لوگوں کے پاس جا کر مدرسہ کی تجویز رکھی ہو گی، بڑی امیدیں لے کر گئے ہوں گے، لیکن لوگوں نے مدرسہ کا نام سنتے ہیں اپنے کانوں پر انگلیاں رکھ لی ہوں گی اور بعض نے تو یہ تک کہہ دیا ہو گا کہ صدیق! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم مدرسہ کی بات کرتے ہو۔

بعد کا وہ نقشہ بھی کیسا تڑپانے والا ہو گا، جب مدرسہ کی کچی دیواروں کے لئے قاری صاحب اپنے سر پر مٹیاں اٹھا کر لا رہے ہوں گے، اور ان کو پانی سے بھگو رہے ہوں گے اور گھر کی خواتین رات کے اندھیرے میں دیواروں کو لیپ رہی ہوں گی۔

خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اللہ اللہ! کتنی مشکلات کے بعد یہ تصویر، یہ ماحول یہ فضا اور یہ صبح پیدا ہوئی ہے جو آج میری طرح کتنوں کے لئے باعث حیرت ہے، کسی سحر کو وجود میں لانے کے لئے ہزاروں مہ وانجم کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، قاری صاحب کی مشکلات کا دور کئی دہائیوں میں پھیلا ہوا ہے، مگر ان کا کمال یہ تھا کہ سخت مشکلات میں بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شب ہے جس کی سحر نہ ہو

وہ جانتے تھے کہ ہر اندھیرے کا انجام اجالے پر اور ہر رات کی انتہا صبح صادق پر ہوتی ہے، کبھی نہ کبھی صبح آئے گی، اور اجالا پھیلے گا، ماضی کی تاریخ ان کے سامنے تھی، انہوں نے اس سے سبق لیا، اور اقبال نے ان کی رہنمائی کی تھی:

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

لوگ اکابر کی انتہا دیکھنے کے عادی ہیں، جب کہ مجھے ان کی ابتداء دیکھنے کا شوق ہوتا ہے، شاید یہ میری کمزوری ہو، لیکن میرے سامنے حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری کا یہ مشہور قول ہے جس کو حضرت شیخ زکریاؒ نے اپنی آپ بیتی میں نقل کیا ہے کہ "جو ہماری ابتدا دیکھے وہ کامیاب اور جو انتہا دیکھے وہ ناکام"۔

جامعہ کے اندر

ہماری گاڑی مدرسہ کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی اور میں عالم خیال میں اپنے سامنے کے منظر کا ابتدائی پس منظر دیکھ رہا تھا، گاڑی چوکور دو منزلہ عمارت کے ایک بڑے دائرے میں داخل ہوئی، جس کو شاید یہاں کی اصطلاح میں "احاطہ جدید" کہا جاتا ہے، پھر ایک خوبصورت شاندار مسجد کے پاس سے گذر ہوا، جس کے جلووں کی ایک برقی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی، اس کے بعد گاڑی نسبتاً ایک چھوٹے دائرے میں داخل ہوئی، جو "احاطۂ قدیم" کہلاتا ہے، اسی دائرے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں سامنے کی تاریخ کی سب سے مرکزی شخصیت اپنی اسی سادگی، بے نفسی اور مسکنت کے ساتھ قیام پذیر تھی، جو اس کو قبل از تاریخ سے وراثت میں ملی تھی، گاڑی نے بریک لیا تو میں تیز اجالوں میں کھڑا تھا ،اور اندھیرے ماضی کے دبیز پردوں میں گم ہو چکے تھے۔

جامعہ کے مقبول و معروف استاذ حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی دامت برکاتہم اور کچھ اساتذہ نے ہمارا استقبال کیا، اور ہم جامعہ کے مہمان خانہ کے ایک کمرے میں پہونچا دیئے گئے، غسل و ناشتہ سے فراغت کے بعد ہمیں "دربار صدیقی" میں جانا تھا، مولانا اسعدی صاحب ہی ہمارے رہنما بن کر تشریف لائے۔

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نہ صرف اس جامعہ میں بلکہ پورے ملک میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، ان کی علمی لیاقت، فقہی بصیرت، دقت نظر، تصنیفات و تالیفات اور مختلف النوع علمی مقالات و مضامین نے سارے ملک سے خراج تحسین وصول کیا ہے، مولانا میرے بزرگوں میں ہیں، اور

ہندوستان کی چند ان شخصیات میں ہیں جن سے بہت زیادہ متاثر ہوں، مولانا کے اصولی تجزیئے، فکری مباحث، اور وسعت مطالعہ کا میں بے حد مداح اور قائل ہوں، اور میرے اس تاثر کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ میں نے خود علمی و فقہی مجالس میں موجود ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت باندویؒ کی مجلس درس میں

حضرت باندویؒ ان دنوں سخت علیل تھے، یہ ان کی وفات سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، زیادہ نقل و حرکت سے معذور تھے، پنڈلی میں درد کی شکایت تھی، اسی لئے وہ اپنے کمرے کے بجائے مسجد ہی کے بغلی حجرہ میں مقیم تھے، وہاں سے مسجد آنا جانا نسبتاً سہل تھا، مسجد ہی ان کی درسگاہ تھی، اور وہی ان کی خانقاہ اور زیارت گاہ بھی، عوام و خواص وہیں پہنچ کر ان سے ملاقات کرتے اور جو بات کرنی ہوتی تھی کرتے تھے۔

ہم جب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ مسجد کے اندرونی حصے کے جنوبی گوشے میں طلبہ کو جلالین کا درس دے رہے تھے، (اس وقت مدرسہ کا معیار تعلیم غالباً جلالین تک ہی تھا) سر جھکائے نہایت خفیف سی آواز میں بول رہے تھے، طلبہ دو صفوں میں تین جانب سے حلقہ بنا کر بغور درس سن رہے تھے، ہم خاموشی کے ساتھ درس میں بیٹھ گئے، آواز بمشکل ہم تک پہنچ رہی تھی، میرے خیال میں دوسری صف کے طلبہ کا حال بھی ہم سے مختلف نہیں تھا۔

شدید حساسیت

میں ان کی اس سخت ریاضت پر حیرت زدہ تھا کہ ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی درس کی اہمیت، وقت کی قیمت، تعلیم کی افادیت اور طلبہ کی تعمیر کا یہ احساس ہے کہ منہ سے آواز نہیں نکل رہی ہے، پاؤں کام نہیں کر رہے ہیں اور درد میں کافی شدت ہے، مگر درس نہیں چھوٹتا، مسجد کی چٹائی پر بیٹھے دنیا کے تمام ناز و نعم سے بے نیاز اپنی تکلیفوں اور پریشانیوں سے لاپرواہ اللہ کی مخلوق کو علم کی دولت بانٹ رہے ہیں۔

علم، وقت اور اپنے فرائض کے بارے میں اتنی شدید حساسیت براہ راست اپنی آنکھوں سے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا، کتابی اور زبانی واسطوں سے اکابر کے اس طرح کے کئی واقعات مجھ تک پہونچے تھے، مگر آج ہتھورا کے اس گاؤں میں ایک مرد مجاہد کی بارگاہ میں بیٹھ کر میں خود ایک واسطہ بننے جارہا تھا

اکابر کی شہادتیں

ایک مجسمۂ نور و سرور میرے سامنے تھا، صدق وصفا، علم و عمل اور تطہیر و تزکیہ کی فضا ہر طرف پھیلی تھی، اور میں اس سراپا میں ایک حیرت انگیز اور عہد ساز شخصیت کو دیکھ رہا تھا، جس کو خود اس کے شیخ و مرشد حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ اپنی ساری زندگی کی کمائی کہتے تھے، فرماتے تھے کہ:

"حافظ صاحب بچپن ہی سے ولی تھے، اگر خدا محشر میں مجھ سے پوچھے کی دنیا سے کیا لائے، تو کہہ دوں گا کہ حافظ صدیق کو لایا ہوں"[6]

میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ وہی شخصیت ہے جس کو مخدوم بہار حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق ناظم جامعہ اشرف العلوم کنہواں ضلع سیتامڑھی بہار اپنے وقت کا قطب کہتے تھے، اور ان کی مجلس کو دربار قرار دیتے تھے[7]

میری خوش بختی تھی کہ میں اسی دربار میں موجود تھا، اور صاحب دربار سے وابستہ سینکڑوں واقعات جو میں نے سن رکھے تھے، آج ان کے خط و خال میں پڑھ رہا تھا۔

بیت الخلا کی صفائی

ہتھورا مدرسہ کے ایک استاذ کا چشم دید بیان ہے کہ:

" مدرسہ میں مسجد کے سامنے بارہ (۱۲) عدد بیت الخلا بنے ہوئے تھے، جو طلبہ اور اساتذہ سبھی کے استعمال میں رہتے تھے، باندہ کے دیہاتی طلبہ ان کو جتنا گندہ کر سکتے

---

[6]- مظاہر علوم اکتوبر ۱۹۹۷ء

[7]- یاد صدیق ص ۱۰۹

تھے کرتے تھے، لیکن صبح کے وقت تمام بیت الخلاء روزانہ دھلے ہوئے ہوتے تھے، کسی کو دھونے والے کا پتہ نہ چلتا تھا، ایک رات تقریباً ڈھائی بجے مجھے بیت الخلا جانے کی ضرورت محسوس ہوئی جب میں کسی قدر قریب پہونچا تو دیکھا کہ کوئی صاحب مسجد کے وضو خانے کا پانی جس گڑھے میں جمع ہوتا تھا اس سے بالٹی میں پانی لے کر بیت الخلا دھو رہے ہیں، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے حضرت ہی ہیں، کہاں کا تقاضا!، خاموشی سے واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حضرت کو یہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا، آگے بڑھ کر حضرت کے شریک ہونے کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت کو راز کے فاش ہو جانے پر افسوس ہو گا، اور حضرت کو یہ سب کرتا دیکھ کر نیند کا کیا سوال، اس کام سے فارغ ہو کر مسجد کے قریب کنویں پر جو نل لگا تھا، وہاں جا کر غسل فرمایا، اور مسجد کے صحن میں تہجد کی نماز شروع کر دی، اللہ ہی جان سکتا ہے کہ اس کے یہاں ان کاموں کا کیا اجر ملے گا، اور اس تہجد کی نماز پر اس کو کتنا پیار آیا ہو گا؟[8]

جن حضرات کے سامنے موجودہ مدارس کے عام مہتممین و نظماء کا روپ ہے، وہ ذرا اس آئینۂ صدیقی میں بھی ایک نظر جھانک کر دیکھ لیں۔

ایثار کی شاندار مثال

انہی صاحب کا بیان ہے کہ:

"ابتدائے ملازمت میں تو میں حضرت کے شامل ہی کھاتا رہا، لیکن جب میں نے الگ کھانا شروع کر دیا تو مطبخ سے بہت ہی سادہ سی دال روٹی آجایا کرتی تھی، اور اکثر بلکہ روز ہی حضرت کے گھر سے ایک پیالہ میں یا چھوٹی سی المونیم کی پتیلی میں کبھی سبزی، کبھی دال آجاتی تھی، اس وقت تک مجھ کو حضرت کے گھر کے کھانے کا حال معلوم نہ

---

[8]- الفرقان لکھنؤ اکتوبر ۹۷ء

تھا، ہتھورا آئے ہوئے شاید چند ہفتے ہی گذرے تھے، ایک دن میں کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرے میں بیٹھ چکا تھا کہ مولانا کی ایک بچی جس کی عمر اس وقت تقریباً چھ سات سال ہوگی میرے لئے سبزی لے کر آئی، میں نے اس سے کہا کہ تم کھانا کھالو، اس نے کہا کہ میں کھاچکی ہوں، میں نے بس یونہی مزید سوال کرلیا کہ کیا کھایا؟ اس نے کہا کہ چٹنی، چاول، میں نے پوچھا یہ سبزی کیوں نہ کھائی، بھولی بھالی بچی نے گھر کی حقیقت صاف صاف بیان کردی کہ یہ تو صرف آپ کے لئے پکتی ہے، یہ سننا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے اس سے کہا تم یہ واپس لے جاؤ، اس نے کچھ تکلف کیا، لیکن میرے اصرار پر واپس لے گئی، کچھ دیر کے بعد پھر لے آئی، لیکن میں نے کسی بچہ کے ہاتھ دوبارہ واپس کردی، بعد میں میں نے حضرت سے اس کی شکایت کی کہ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تو چٹنی کھائیں اور میرے لئے اہتمام سے سبزی یا اچھی سی دال بنا کر بھیجی جائے، مجھے اتنا بے حمیت اور خود غرض نہ سمجھیں، حضرت نے اس واقعہ کو بالکل ہی اہمیت نہ دی، اور فرماتے رہے کہ پتہ نہیں بچی نے آپ سے کیا کہہ دیا، اور آپ اتنا متأثر ہوگئے، ارے بچے تو گھروں میں بہت کچھ کھاتے رہتے ہیں، میں نے ہی ہار مان لی اور یہ سلسلہ چلتا رہا[9]

غم کے موقعہ پر دوسروں کا خیال

میری نگاہ میں وہ واقعہ بھی گھوم گیا، جب حضرت کی چہیتی صاحبزادی حمیراء اللہ کو پیاری ہوئی تھی اور گھر پر موت کا سناٹا چھا گیا تھا، اتفاق سے اسی دن جامعہ کے استاذ حافظ ضیاء الدین صاحب کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا، ایسے سنگین موقعہ پر بھی گھر سختی سے ہدایت فرمارہے تھے کہ زیادہ خواتین حافظ ضیاء الدین صاحب کے یہاں رہیں، ان کی اہلیہ کا غم ہلکا کریں، تاکہ انہیں پردیس کی غربت کا احساس نہ ہو

---

[9]- ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ص ۳۵، اکتوبر ۹۷ء

-[10]

ایثار و قربانی اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے، سلف میں تو ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں، مگر ہمارے اس دور انحطاط میں یہ جنس نایاب ہے۔

کسی محرم اسرار کی صحبت بھی ضروری ہے

آج جب میں ایسے نادر و نایاب شخص کی مجلس میں موجود تھا، تو مجھے اپنی خوش نصیبی کا جو احساس تھا، اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دینا اور صالحین کی صحبت میں کچھ وقت گذارنا اللہ کو بھی بہت پسند ہے، بہت سے رازہائے سربستہ جو کتابوں سے حل نہیں ہوتے وہ کسی محرم اسرار کی صحبت میں حل ہو جاتے ہیں۔

اکبر الہٰ آبادی نے اسی حقیقت کی سچی ترجمانی کی تھی:

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے
رہیے کچھ روز کسی محرم اسرار کے پاس

صدیق تو صدیق ہے

آج میں اس آستانے پر حاضر تھا تو مجھے حضرت تھانویؒ کا وہ آستانہ یاد آرہا تھا، جہاں یہی ہمارے قاری صدیق احمد صاحبؒ اپنے عمر نامی ایک ساتھی کے ہمراہ غلامانہ حاضر ہوئے تھے، اس حاضری کا واقعہ خود حضرت ہی زبانی سنیئے:

"میں اپنے ایک ساتھی عمر نامی کے ساتھ تھانہ بھون حاضر ہوا، وہ مجھ سے سبقت کر کے پہلے ہی حضرت سے ملاقات کرنے چلے گئے، مصافحہ کیا اور خاموش کھڑے ہو گئے، جب کہ حضرت کے یہاں پہنچتے ہی تین باتیں بتلانا ضروری تھیں، کہاں سے

---

[10]- یاد صدیق ص۷۹

آئے؟ کیوں آئے؟ کب جانا ہے؟ حضرت برس گئے اور بہت ناراض ہوئے کہ لوگ وقت ضائع کرنے چلے آتے ہیں، میں اس کے بعد حاضر ہوا، اور سلام و مصافحہ کے بعد فوراً عرض کیا، سہارن پور سے آیا ہوں، ملاقات کے لئے آیا ہوں، کل چلا جاؤں گا، آپ نے پوچھا کیا نام ہے؟ میں نے عرض کیا صدیق احمد، اس پر میرے ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ عمر فاروقؓ تو ابو بکر صدیقؓ سے بڑھ نہیں سکے اور تم چاہتے ہو کہ ان سے بڑھ جاؤ یہ کیسے ہو گا؟[11]

موت سے پہلے آرام نہیں

میں خیالات کے سیل رواں میں بہتا رہا، ادھر علوم باندوی کی نہر سلسبیل تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہی، اسی دوران کچھ گجرات سے آئے ہوئے علماء بھی درس میں شامل ہو گئے، دیہات سے آئے ہوئے تعویذ کے حاجت مند لوگوں کی ایک تعداد بھی جمع ہو گئی، درس سے فارغ ہوئے، طلبہ کی جماعت گئی تو دوسری جماعتیں حضرت سے ملنے کے لئے آگے بڑھنے لگیں، اور حضرت اسی طرح خوشگوار تبسم کے ساتھ سب لوگوں سے ملتے رہے، باتیں کرتے رہے، ان کی ضرورتیں حسب امکان پوری کرتے رہے، میں سوچتا رہا کہ ایک بیمار، درد سے لاچار، نقل و حرکت سے معذور اور پیر ناتواں اتنا توانا اور مصروف ہے، یہ ان کے آرام کا وقت ہے، مگر اس وقت میں بھی خلق خدا کی خاطر انہوں نے اپنا آرام حرام کر لیا ہے، ایسا لگتا تھا کہ خلق خدا کی یہ فکر، یہ تڑپ، یہ درد اور یہ غم موت سے قبل ان کو چھٹی نہیں دے گا، غالبؔ نے جیسے انہی کے لئے کہا ہو:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

---

[11]- یاد صدیق ص ۸۲

ہماری باری

بالآخر ہماری بھی باری آئی اور باریابی کا شرف حاصل ہوا، بزرگوں کی خدمت میں ہدیہ پیش کرنا سنت ہے، میرے ساتھی لوگ بہت کچھ لے کر گئے تھے، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا، میں نے اس سنت کے ساتھ عطر کی سنت جوڑ دی اور حضرت کی خدمت میں یہی تحفہ پیش کیا، میں ان کے لئے بالکل نووارد تھا، وہ شاید نووارد وں کا تحفہ جلدی قبول نہیں کرتے تھے، میری پیش کش پر چند لمحے تأمل فرمایا، پھر بخوشی قبول فرمالیا، میں نے دل میں کہا:

ع گر قبول افتد زہے عزو شرف

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حضرت کو غائبانہ طور پر میری بعض تحریروں اور خطوط کے ذریعہ اجمالی واقفیت تھی، بعض احباب نے تعارف کرایا، بالخصوص حضرت کے خادم خاص مولانا مفتی محمد زید کانپوری استاذ جامعہ عربیہ ہتھورانے، تو حضرت کی نظر کرم میں کچھ خصوص پیدا ہو گیا۔

تعویذ کا راز

میں نے حضرت سے عرض کیا کہ ملاقات اور دعا کے لئے حاضر ہوا ہوں، حضرت نے دعا فرمائی، کندھے پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا کہ میرے پاس زیادہ تر لوگ تعویذ کے لئے آتے ہیں ، اللہ کے لئے تو بہت کم لوگ آتے ہیں، پھر کہا کہ ہمارا علاقہ انتہائی پسماندہ ہے، یہاں کے لوگوں کو قریب کرنے اور کو مربوط رکھنے کے لئے تعویذ ہی ایک وسیلہ ہے، یہ بہت مشکل کام ہے، مگر مدرسہ کی خاطر میں نے اس مشکل کو قبول کر لیا۔۔۔ اسی موقعہ پر یہ بھی فرمایا کہ تعویذ لکھنے میں میرا بہت وقت چلا جاتا ہے، جتنا وقت میں نے تعویذ لکھنے میں صرف کیا ہے اتنے میں بہت سی کتابیں لکھ سکتا تھا۔۔۔۔ روزانہ سینکڑوں تعویذیں لکھنا آسان کام نہیں ہے، وہ بھی زیادہ تر لوگ ایک تعویذ پر بس نہیں کرتے تھے ، مفت کی چیز جتنی مل جائے کم ہے، دو دو، تین تین، چار چار تعویذوں کا مطالبہ کر دیتے تھے، اپنے لئے، بیوی کے لئے، بچے کے لئے، ماں کے لئے، وغیرہ کبھی حضرت ناراض ہو جاتے کہ نہیں دوں گا، چلے جاؤ، اتنی اتنی تعویذ مانگی جاتی ہے؟، وہ بیچارہ افسردہ ہو جاتا تو کہتے اچھا آؤ لے لو، مگر آئندہ اتنی تعویذ مت مانگنا

، یہی روز کا شغل تھا۔۔۔ مفتی محمد زید صاحب کا تو زیادہ وقت تعویذ لکھنے ہی میں صرف ہوتا تھا، جو وقت بچتا اس میں حضرت کے ملفوظات و واقعات لکھتے تھے ، اور اس سے بھی جو وقت بچتا تھا اس میں طلبہ کو درس دیتے تھے۔

مفتی محمد زید مظاہری

مفتی صاحب موصوف ایک نوجوان اور با صلاحیت عالم دین ہیں ،(اب تو یہ بھی بوڑھے ہو چلے) لکھنے پڑھنے اور جمع و ترتیب کا اچھا ذوق ہے ، مضامین و مقالات اچھا لکھتے ہیں، مگر مجھے سب سے زیادہ ان کی جس چیز نے متاثر کیا، وہ حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وافادات پر موضوعاتی کام ہے، حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وافادات کے وسیع ذخیرہ کو موضوعاتی طور پر مرتب کر رہے ہیں، کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور باقی آئندہ آنے کی توقع ہے، حضرت تھانویؒ کے ملفوظات پر ہندستان میں اس انداز کی یہ پہلی باقاعدہ کوشش ہے، میں ان کے اس عظیم کارنامے پر ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، یقیناً یہ بھی حضرت باندویؒ ہی کی صحبت کا فیض اور انہی کے علوم کا ایک حصہ ہے۔

یہ راستہ بڑے مجاہدے کا ہے

میں نے عرض کیا حضرت! میں نے اپنے وطن میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لئے دعا اور رہنمائی کی درخواست ہے ، میں نے اپنے علاقے کے حالات اور وہاں مدرسہ کی ضرورت کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا، حضرت نے سب سن کر فرمایا: کام کرتے جایئے، اللہ کی نصرت نازل ہو گی، اللہ کی نصرت کام کی بنا پر ہوتی ہے، اشخاص کی بنا پر نہیں، پھر اپنی ریاضت بھری زندگی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا کہ سینتالیس (۴۷) سال سے میں جد وجہد کر رہا ہوں، لیکن سہولتوں کے دروازے کھلے ہوئے ابھی بہت زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں، فرمایا کہ میں نے اپنی جد وجہد کا آغاز فتح پور مدرسہ سے الگ ہونے کے بعد باندہ شہر سے کیا تھا، مگر بعض حالات کی بنا پر وہاں کامیابی نہ مل سکی، اور وہ شہر چھوڑ دینا پڑا، پھر "بھینی" کے مقام پر کوشش کی مگر وہاں بھی بات نہ بن سکی، لاچار اپنے گاؤں ہتھورا میں جامعہ عربیہ کی بنیاد ڈالی، جو آج اللہ کے فضل سے آپ کے سامنے ہے۔

مجھے اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑی، اس وقت یہاں آنے جانے کی بھی کوئی سہولت نہ تھی ، باندہ سے ہتھورا تک پیدل چل کر آتا تھا، برسات کے زمانے میں گھٹنوں اور کمر تک پانی عبور کر کے آنا پڑتا تھا، اس کے بعد اللہ کے کرم سے کئی با اثر شخصیتوں کی توجہ سے یہ روڈ بنا اور پل تیار ہوا۔۔۔۔۔ حضرت نے ان شخصیات میں کچھ کے نام بھی لئے تھے، مگر آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں سمجھ نہ سکا۔۔۔۔ حضرت نے مجھے صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ یہ راستہ بڑے مجاہدے کا ہے، بڑی مشکلات پیش آئیں گی، مجھے خوب تجربہ ہے، اس لئے صبر و شکر کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

قاری صاحبؒ کی فراست ایمانی کا ذاتی تجربہ

جس وقت حضرت یہ سنا رہے تھے اس وقت تک مجھے اس سلسلے میں کسی بڑی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا اور نہ کسی جگہ پر ناکامی کے بعد دوسری جگہ مدرسہ شروع کرنے کا کوئی خیال آیا تھا، مجھے حیرت تھی کہ حضرت مجھے یہ سب کیوں سنا رہے ہیں؟

مگر میں اسے کیا کہوں، ان کا کشف کہوں، یا کرامت کہوں، ایمانی فراست کا نام دوں، یا غیر اختیاری طور پر خدا کی طرف سے ان کی زبان پر جاری شدہ کلمۂ حقیقت کہوں،۔۔۔۔ کہ جس وقت حضرت یہ سب مجھے کہہ رہے تھے، عین اسی وقت میرے مدرسہ میں وہ سب کچھ ہونے کی تیاری ہو رہی تھی، میرے خلاف سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے، میرے غائبانے میں کچھ شر پسند عناصر عہد جاہلیت کی ساری سنتیں تازہ کر دینا چاہتے تھے، اور اس کی مجھے خبر اس وقت ملی جب مکمل دس روز کے سفر کے بعد میں حیدرآباد واپس پہونچا، واپسی کے دوسرے دن رات میں مجھے سمستی پور سے فون موصول ہوا، اور مدرسہ کے انتشار اور فساد کی خبر دی گئی۔۔۔۔۔ فون سنتے ہی حضرت باندویؒ کی ملاقات کا منظر میرے سامنے تازہ ہو گیا اور ان کی ایک ایک بات یاد آنے لگی، اس مرد حق آگاہ نے فتنوں کا سامنا کرنے سے پہلے ہی مجھے ان سے آگاہ کر دیا تھا، میں فتنوں کے سد باب کے لئے وطن روانہ ہو گیا، اس عظیم عنایت کے لئے میں ان کو شکریہ کا ایک خط بھی نہ لکھ سکا، اور وہ ہماری اس دنیا سے ہمیشہ ہمیش کے لئے رخصت ہو گئے، مجھے اس حادثہ کی اطلاع سمستی پور میں اس وقت ملی جب میں فتنوں کی طوفانی آندھیوں

کے بیچ جھول رہا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ شکریہ کا ایک خط حضرت باندویؒ کو فتنوں کے اختتام پر لکھوں گا، بلکہ حاضری دوں گا، لیکن اس کی نوبت نہ آسکی، اور ان فتنوں کے اختتام سے قبل خود حضرت ہی کی حیات مستعار کا سلسلہ اختتام پذیر ہو گیا، اور ان کے آستانے پر میری حاضری سے پہلے ہی وہ خود اپنے مالک کے حضور چل بسے، واللہ یفعل ما یشاء، وھو العلیم الحکیم۔

بہر حال بات حضرت باندویؒ کی مجلس کی چل رہی تھی، مگر ان کے چند جملوں کی تفسیر کے لئے بات اظہار حقیقت تک جا پہنچی، آیئے پھر اسی مجلس میں چلتے ہیں، میں نے حضرت کے سامنے اپنے مدرسہ میں جلسہ کرنے کا خیال بھی پیش کیا، اور اس کی سرپرستی کے لئے حضرت سے تشریف لے چلنے کی درخواست کی، حضرت نے اپنی معذوری بیان فرمائی، اور کہا کہ تاریخ مقررہ سے ایک ماہ قبل خط لکھئے گا، پاؤں میں ابھی شدید تکلیف ہے، اس وقت اگر چلنے کے قابل رہا تو ضرور چلوں گا، ان شاء اللہ۔

مگر میری ملاقات کو ابھی ایک چلّہ بھی نہ ہوا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور یہ مرد بیمار جو چند قدم چلنے سے بھی مجبور تھا، اچانک بہت لمبے سفر پر روانہ ہو گیا، ایک ایسے سفر پر جس سے وہ کبھی واپس نہیں ہو گا۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات

اسی مجلس میں نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات آئی، تو دیکھا کہ وہ اس سلسلے میں کافی رنجیدہ تھے، فرمانے لگے کی یہ محض سہل پسندی ہے، اس سے طلبہ کی صلاحیتوں کو نقصان پہونچے گا، فرمایا کہ نصاب سے زیادہ نظام کو درست کرنے کی ضرورت ہے، نصاب میں ترمیم و تبدیل حالات کے مطابق ہو سکتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ساری مشکل اور اہم کتابوں کو نصاب سے خارج کر دیا جائے، وہ بھی ابھی جب کہ ان کی متبادل کتابیں موجود نہیں ہیں، قاری صاحب نے فرمایا پہلے ایک مکمل نصاب آپ بنا کر دکھایئے، اہل نظر پر اس کی افادیت ثابت کیجیے، پھر نصاب کو چھیڑیئے، متبادل انتظام ہونے سے قبل کسی روایت کو تبدیل کر دینا کوئی اچھی علامت نہیں ہے، فرمانے لگے کہ صرف لبیک کہنے والوں

کو نہیں بلکہ اہل بصیرت اور ارباب نقد و نظر کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی پہلی مجلس میں مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ قاری صاحب جتنے جمالی اور نرم و نازک نظر آتے ہیں، وہ ہر معاملے میں ایسے نہیں ہیں، بلکہ بہت سے معاملات میں ایک آہنی شخصیت بھی ہیں، جس موقف کو وہ حق سمجھتے ہیں اس سے وہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔

دین کے معاملے میں کسی کا خوف نہیں

ان کے اسی دینی تصلب کی مثال ایمر جنسی کے زمانے کا وہ واقعہ بھی ہے جس کو مولانا زکریا سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے تأثرات میں نقل کیا ہے کہ:

> ”ایمر جنسی کے زمانے میں ضلع باندہ کے کلکٹر جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک وزیر جو مسلمان ہی تھے، مولانا سے نس بندی کے جواز پر فتوی لینے کے لئے حاضر خدمت ہوئے، حضرت اس وقت باندہ شہر کی جامع مسجد میں معتکف تھے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، مولانا نے بہت ہی نرم کلامی سے کام لیا اور ان سے فرمایا کہ ہمارے بڑے دہلی، دیوبند اور لکھنؤ میں موجود ہیں، آپ ان سے فتوی لے لیں، ہر ہر شخص سے فتوی لینے کی ضرورت نہیں، لیکن وہ لوگ مولانا ہی سے جواز کا فتوی لینا چاہتے تھے، اپنی درخواست پر مصر رہے، اثناء گفتگو کلکٹر صاحب کی زبان سے یہ نکل گیا کہ مولانا! آپ اس کی فکر نہ کریں کہ کوئی شخص آپ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکال سکتا ہے، مولانا کو اس بات پر بہت غصہ آیا، اور فرمایا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جائز و ناجائز کا مسئلہ لوگوں کی ناراضی اور رضامندی پر اور ان کے خوف و بے خوفی کی بنیاد پر دوں گا، لہجہ سخت تھا، اس لئے کلکٹر صاحب کے مصاحبین میں سے کسی نے کہا، مولانا آپ کو معلوم ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟، مولانا نے اسی سخت لہجہ میں جواب دیا کہ میں جانتا ہوں، یہ کلکٹر ہیں اور یہ وزیر، اور پھر یہ بھی کہا، جو کچھ آپ حضرات کر سکتے ہیں کر لیں میں نس بندی کے جواز کا فتوی نہیں

دوں گا، آخر وہ بے چارے چلے گئے، اور مولانا کی مقبولیت کی وجہ سے کچھ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ورنہ ایمر جنسی کا زمانہ تو بس، العیاذ باللہ [12]

ایک تازہ تصنیف کا مسودہ دیکھنے کا اعزاز

ان دنوں حضرت قاری صاحبؒ منطق کی مشہور کتاب ''شرح تہذیب'' کی اردو شرح لکھ رہے تھے، شرح تہذیب عام طور پر مدارس کے نصاب میں ضابطہ کی بحث تک پڑھائی جاتی ہے، مگر حضرت مکمل کتاب کی شرح لکھ رہے تھے۔ مولانا نور الدین اعظمی کو مخاطب کر کے فرمایا:

" آپ دونوں آدمی اس کو ذرا دیکھ لیں، ضابطہ کی بحث سے آگے کی کوئی شرح نہیں ملتی، جب کہ بہت سے مقامات مغلق ہیں، میں نے اپنے ذوق سے اس کی وضاحت لکھ دی ہے، لیکن چاہتا ہوں کہ دوسرے اہل علم بھی اس کو دیکھ لیں، تا کہ کوئی مناسب بات سامنے آئے تو اس کو درج کر دیا جائے"

یہ حضرت کی تواضع و احتیاط تھی، ورنہ منطق و فلسفہ میں وہ اس دور میں امامت کے منصب پر فائز تھے، منطق سے ان کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی، یہ ان کی دلچسپی اور لگن ہی کی بات تھی کہ صرف منطق میں اختصاص حاصل کرنے کے لئے انہوں نے فراغت کے بعد بہار کی قدیم دینی درسگاہ جامع العلوم مظفر پور میں چند ماہ قیام کیا، اور وہاں امام المنطق و الفلسفۃ حضرت مولانا جمیل احمد صاحبؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا [13]

آج وہ خود امام تھے، اور ایک امام معمولی نو آموزوں سے اپنی کتاب دیکھنے کو کہہ رہا تھا، کسر نفسی، تواضع، علمی احتیاط اور دیانت کی اس کو انتہاء کہنا چاہیے۔

ہم لوگ حسب الحکم مجلس سے اٹھ گئے اور حضرت کی کتاب کا مسودہ لے کر مہمان خانے کی

---

[12]- الفرقان اکتوبر ۱۹۹۷ء

[13]- مظاہر علوم اکتوبر ۹۷ء، نقیب ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء

بالائی منزل کے برآمدے پر چلے آئے، میں نے شرح تہذیب مدرسہ دینیہ غازی پور میں اپنے دو قابل ترین اساتذہ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ سابق صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڑھ یوپی اور حضرت مولانا عبدالرب صاحب اعظمی دامت برکاتہم ناظم مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج ضلع اعظم گڑھ یوپی سے پڑھی تھی، اس کے بعد دیوبند کی معین المدرسی کے زمانے میں اس کو پڑھانے کا بھی موقعہ ملا تھا، لیکن حضرت قاری صاحبؒ کے حکم پر آج ایک طلب میرے اندر پھر جاگ گئی تھی اور مسودہ دیکھنے والی ٹیم میں میں محض اس لئے شامل ہو گیا تھا کہ آج ایک امام منطق کے آستانے پر خود انہیں کے قلم سے ایک مانوس کتاب کے تعلق سے مزید معلومات فراہم ہوں گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا مجھے اس سے بہت کچھ حاصل ہوا، ہمارے پاس وقت کم تھا، ہمیں صرف چوبیس (۲۴) گھنٹے وہاں قیام کرنا تھا، لیکن اس میں بھی اس کام کے لئے ہم جتنا وقت فارغ کر سکے، وہ بہت غنیمت اور فائدہ بخش ثابت ہوا، ہمارے پاس علم ہی کیا تھا، ہم مسودہ کے ایک نقطے پر بھی سوالیہ نشان نہ لگا سکے۔

مروجہ دفتری نظام کا فقدان

بعد نماز ظہر ہم نے جامعہ کے کتب خانہ کی سیر کی، رہنمائی حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب دامت برکاتہم کی رہی، کتابوں کا بڑا ذخیرہ وہاں موجود پایا، البتہ کتب خانے کے لئے کوئی مستقل ملازم نہ ہونے کی وجہ سے نظم وضبط اور صفائی ستھرائی میں کمی کا احساس ہوا، ایک کتب خانہ کیا وہاں کسی بھی شعبہ کے لئے (اس وقت) کوئی ملازم نہیں تھا، وہاں سرے سے کوئی دفتری نظام ہی نہیں تھا، حضرت کا کہنا تھا کہ یہ سب اساتذہ اور طلبہ سے متعلق امور ہیں، اس لئے اپنا کام انسان کو خود کرنا چاہیے، الگ سے آدمی رکھنے کی کیا ضرورت کیا ہے؟ اسی بنا پر وہ خود بھی کام کرتے تھے، اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

نصف صدی قبل کا ایک طالب علم

بعد نماز عصر ہم لوگ جامعہ کی عمارت کا چکر لگاتے ہوئے جامعہ کے مطبخ کی طرف چلے گئے، اس وقت طلبہ میں کھانا تقسیم ہو رہا تھا، طلبہ کئی لائنوں میں بڑے سکون کے ساتھ کھڑے تھے، مطبخ کافی

کشادہ ہے، آٹا چکی وغیرہ کا نظم بھی ہے، میں تھوڑی دیر کھڑا طلبہ میں تقسیم طعام کا منظر دیکھتا رہا، دفعۃً عالم خیال میں نصف صدی قبل کانپور مدرسہ کا ایک غریب طالب علم میرے سامنے آگیا، جس کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا، بیوہ والدہ نے کچھ کر کرا کے تھوڑا بہت انتظام کر کے کانپور بھیج دیا، ساتھ میں کچھ سوکھی روٹیاں اور غالباً تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے تھے، کانپور کے کسی مدرسہ میں جا کر داخلہ لیا ، مدرسہ سے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکا، کچھ دن تو ساتھ لائے ہوئے سامان پر گذارا کیا، جب وہ ختم ہو گیا ،ایک وقت کے کھانے کا انتظام اس طرح ہوا کہ کانپور کے ایک استاذ صاحب نے فرمایا کہ لڑکے ! تم ہمارے گھر سرکاری نل سے پانی بھر دیا کرو، اور ایک وقت کا کھانا ہمارے گھر سے لے لیا کرو، استاد صاحب کا گھر بالائی منزل پر تھا، بیچارہ طالب علم دو دو بالٹی لے کر زینہ پر چڑھتا تھا، کمزور طالب علم چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کا کھانا ملتا تھا، بیچ زینہ میں کھڑا ہو کر رو لیا کرتا تھا، ابھی ایک مہینہ بھی اس ایک وقت کے کھانے کے انتظام کو نہ ہوا تھا کہ اسی کے گاؤں کا ایک ساتھی پڑھنے کے لئے کانپور آگیا، اب صورت یہ ہوگئی کہ ایک وقت کا کھانا اور دو آدمی ،کچھ دنوں کے بعد ایک ساتھی اور آگیا ، اور چوبیس (۲۴) گھنٹے میں صرف ایک ایک چپاتی حصہ میں آتی تھی ،یہ نیا آنے والا ساتھی اس آزمائش کو برداشت نہ کر سکا، اور جلد ہی وطن واپس چلا گیا، لیکن اس یتیم طالب علم اور اس کے ساتھی نے پورا ایک سال صرف ایک وقت کی نصف خوراک پر گذار دیا۔

آپ جانتے ہیں ؟ وہ یتیم طالب کون تھا؟ وہ اسی ہتھورا گاؤں میں ۱۳۴۲ھ میں مطابق ۱۹۲۳ء میں جناب سید احمدؒ کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ "صدیق احمد" تھا، جو بعد میں قطب الارشاد، اویس زمانہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ کی حیثیت سے معروف و مشہور ہوا، جس کو اپنے عہد طالب علمی میں ایک وقت کا کھانا صحیح طور پر میسر نہ ہوا، آج اسی کے لنگر خانے سے سینکڑوں طلبہ کو روزانہ دو دو وقت کا کھانا مل رہا ہے، جس نے استاذ کے گھر کی غلامی کر کے اور رو رو کر طالب علمی کے ایام کاٹے تھے، آج اپنے طلبہ کو اچھی سہولتیں، خوشگوار مسرتیں اور بہتر مستقبل فراہم کرنے کے لئے اس نے خود کو نثار کر دیا تھا۔

میں سوچنے گا پتہ نہیں ان طلبہ کو بھی یہ احساس ہے کہ نہیں، اگر انہیں اس احساس کا کچھ حصہ بھی مل جائے تو یقیناً وہ اپنے آپ کو کسی لائق بنا کر حضرت باندویؒ کا خواب پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

جامعہ کا مارکیٹ

مطبخ سے نکل کر ہم جامعہ کی دکانوں کی طرف چلے گئے، ہتھورا چونکہ ایک بہت ہی چھوٹا گاؤں ہے، جہاں ضروریات کی چیزیں بھی ملنی مشکل ہیں، اس وجہ سے حضرت باندویؒ نے مدرسہ کی طرف سے ایک مختصر سا مارکیٹ بنوایا ہے، جس میں اس وقت دس دکانیں ہیں، جن میں ضروریات کی اکثر چیزیں فراہم ہیں، یہ دکان جامعہ کے اساتذہ کو کرایہ پر دے دی گئی ہیں اور اساتذہ خالی اوقات میں اپنی یہ دکانیں چلاتے ہیں، اس میں کرایہ دار اساتذہ کا بھی فائدہ ہے، اور دوسرے وہاں کے لوگوں کا بھی، دینی مدارس کے لئے حضرت باندویؒ کا یہ عمل ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

مولوی گنج

ایک اور بات مجھے وہاں کی بہت اچھی لگی وہ یہ کہ تمام اساتذہ و ملازمین کے لئے فیملی کوراٹر کا مستقل انتظام ہے، وہ پورا علاقہ جہاں فیملی کوارٹرز بنائے گئے ہیں، ''مولوی گنج'' کہلاتا ہے، معلوم ہوا کہ ابھی سینتالیس (۴۷) خاندان ان کوارٹروں میں مقیم ہیں، مجھے خیال آیا کہ جب بنجر اور ویران علاقے میں کسی ایک مہذب مہمان کی خوشگوار ضیافت ناممکن تھی، آج اسی ویرانے میں ایک ہزار طلبہ، معزز اساتذہ و ملازمین کے سینتالیس خاندان آباد ہیں، اللہ اکبر۔۔۔۔ دوسرے مدارس کو بھی اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حضرت باندویؒ کا آبائی مکان

وہاں سے ہم گاؤں کی طرف نکل گئے اور وہ کھپڑا پوش جھونپڑا دیکھا جو حضرت باندویؒ کا آبائی مکان ہے، جس کے صحن میں ان کا معصوم بچپن گذرا، اور جس کے در و دیوار کے بیچ وہ پروان چڑھے،

آج اسی جھونپڑے میں پیدا ہونے والے ایک بچے نے اسلام کا ایک قلعہ تعمیر کر دیا تھا، مکان کے متصل ایک پختہ مکان نظر آیا، معلوم ہوا کہ صاحبزادہ محترم حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب دامت برکاتہم نے یہ اپنے طور پر بنوایا ہے، معلوم ہوا کہ گھر کے افراد آج کل اسی پختہ مکان میں رہتے ہیں، اس لئے کہ کھپڑا پوش مکان کا بیرونی برآمدہ بالکل ویران اور غیر آباد سا محسوس ہوا، مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا ،لوگوں کو اس کی تاریخی اہمیت کا احساس کرنا چاہیے۔

جامعہ عربیہ کا نقطۂ آغاز

ہم وہاں سے گاؤں کی اس چھوٹی سی مسجد کے پاس آئے جہاں سے جامعہ عربیہ کا آغاز ہوا تھا وہ گاؤں کے کسی شخص کا ذاتی مکان تھا، جو عارضی طور پر مدرسہ کے استعمال میں لیا گیا تھا، اسی سے قریب وہ مخدوش مکان بھی نظر آیا جو ایک زمانے میں جامعہ کے ہوسٹل کے طور پر استعمال ہوتا تھا، آج وہاں بندھے ہوئے جانوروں کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ ایک وقت میں یہاں قرآن کی تعلیم ہوتی تھی، آج یہاں جانوروں کی غلاظتیں پڑی ہوئی ہیں، زمینوں کا بھی اپنا نصیب ہوتا ہے، کبھی کوئی شاہی محل بالکل کھنڈر بن جاتا ہے، اور چمگاڈروں اور پرندوں کا وہاں بسیرا ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی کباڑ خانہ اتنا مقدس ہو جاتا ہے کہ پاس ادب سے وہاں نگاہ نہیں اٹھتی۔

مولانا مرحومؒ

عصر کے بعد کی یہ تفریح بڑی پر لطف اور سبق آموز رہی، بعد نماز مغرب ہم نے سوچا اس مدرسہ کی ایک ادبی شخصیت سے ملاقات کی جائے، جن کی ایک نعت سے میں اپنے قیام دیوبند کے زمانے میں بہت متاثر ہوا تھا، وہ ہیں حضرت مولانا انتظام حسین مرحوم استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، میں نے ان کا کلام سنا تو واقعتاً ان کو مرحوم ہی سمجھا تھا، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ مرحوم ابھی زندہ ہیں، اور مرحومؒ ان کا شاعرانہ تخلص ہے، تو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہوا، یوں بھی کسی مرحوم سے ملنے کی انسان کو بڑی طلب ہوتی ہے، یہ تو خیر سے اچھے شاعر بھی تھے، مگر کوئی اتفاق ہی نہیں ہوا بانده جانے کا، اس لئے آج تک ملاقات سے محروم تھا، آج یہ اتفاق ہاتھ آیا تھا، تو اس کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا، اور مرحومؒ کی

ملاقات سے محرومی کیوں مول لیتا؟

ہم نے حضرت مرحومؔ کا پتہ معلوم کیا اور ان کے کمرے میں جا دھمکے، ایک چھوٹے سے کمرے میں زمین پر بچھے فرش پر ایک دبلا پتلا صاف رنگ کا بوڑھا شخص بیٹھا تھا، آنکھوں میں بلا کی ذہانت چمک رہی تھی، شکن آلود پیشانی پر سوچ کے آثار تھے، مگر چہرہ شاعرانہ سے زیادہ مفکرانہ اور عالمانہ لگتا تھا، ہم ان کے لئے بالکل اجنبی تھے، مگر انہوں نے بڑا خوشگوار خیر مقدم کیا، تعارف ہوا، تو پتہ چلا کہ انہیں ہماری آمد کی خبر تھی، میں نے ان سے شاعرانہ حیثیت میں ملاقات چاہی تو وہ گویا تیار بیٹھے تھے، میں نے ان کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا تو وہ پھڑک اٹھے، اور کھل گئے، اپنی ڈائری نکالی اور شروع ہو گئے، اس محفل شعر و نغمہ میں رنگ بھرنے میں ہمارے رفیق سفر حافظ شہاب الدین سلطانپوری نے بھی اچھا کردار ادا کیا، وہ دوسروں کی نعتیں اور غزلیں بڑے اچھے انداز میں پڑھتے ہیں، آواز بھی پائی ہے اور انداز بھی۔

عشاء کی اذان پر مجلس ختم ہو گئی، عشاء کے بعد پھر یہ مجلس بزم قائم ہوئی اور گیارہ بجے شب تک جاری رہی، اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مرحوم میں شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ سنانے کی بھی صلاحیت ہے، مگر وہ تحت اللفظ سناتے ہیں، عموماً اپنا کلام وہ دوسرے مترنمین سے سنواتے ہیں، میرے پاس ان کا کلام محفوظ نہیں رہا، ورنہ چند نمونے ضرور پیش کرتا، بس اتنا تبصرہ کر سکتا ہوں کہ ان کے کلام میں گہری فکریت، عصری حسیت، سلاست و شگفتگی، لب و لہجہ کی تازگی، شیفتگی و وارفتگی اور ترنم و موسیقیت کے عناصر وافر مقدار میں ملتے ہیں، حضرت باندویؒ کی شان میں بھی انہوں نے قصیدے لکھے ہیں، جامعہ عربیہ کا ترانہ بھی کہا ہے، غزل، حمد، نعت اور نظم کی صنفوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

کل کے اس ویرانے میں آج کے مرحوم کا کلام کسی کوئل کی گیت سے کم نہیں لگتا، اس گلشن صدیقی سے قبل جب یہاں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ رہا ہو گا، اس وقت اس علاقے میں دوسر سے چڑے چڑیوں کے ساتھ کوئل کا بسیرا بھی رہا ہو گا، آج اس موجودہ گلشن کے کوئل حضرت مرحوم تھے، پتہ نہیں وہ اور کیا کیا تھے، لیکن ہم تو آج کی شب ان کی شخصیت کا یہی پہلو پوری طرح دیکھ سکے، (اب یہ بھی اللہ

کے جوار رحمت میں پہونچ چکے ہیں فرحمہ اللہ)

حضرت باندویؒ بحیثیت شاعر

خود اس گلشن کے مالی حضرت باندویؒ بھی بہترین شاعر ہیں، ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد واثر، سوز وساز اور والہانہ پن ہے، جو ان کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے، شاعری میں اپنا تخلص ثاقبؔ کرتے ہیں، یون تو حضرت ثاقبؔ کو ہر صنف سخن میں قدرت حاصل ہے، مگر ان کی شاعری کا بڑا محور نعت اور نظم ہے، ان کے اشعار درد واثر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، اور سیدھے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں، دراصل:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

ان کے یہاں کسی قسم کا تصنع محسوس نہیں ہوتا، ایسا لگتا ہے، جیسے وہ جو کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں، صدق وراستی اور حقیقت بیانی انکی شخصیت کی طرح ان کے کلام کا بھی خاصہ ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

نعتیہ شاعری میں ان کا جذب اندروں پوری طرح جھلکتا ہے، ایک نعت کا یہ مقطع کتنا جاندار، دل کش اور پر اثر ہے:

جو پہنچا حشر میں ثاقبؔ فرشتے سب پکار اٹھے
محمدؐ کے غلاموں کے غلاموں کا غلام آیا

"صہبائے مدینہ" میں آپ کی کچھ نعتیں شائع ہو چکی ہیں، ایک نعت میں دیکھئے انہوں نے اپنے جذبۂ دل اور اور وفور شوق کی کتنی اچھی عکاسی کی ہے:

وفور شوق میں ہر جذبۂ دل میرے کام آیا
کبھی لب پر درود آیا، کبھی لب پر سلام آیا
سفینہ جب گھر میرا حوادث کے تھپیڑے میں
پئے تسکین خاطر لب پہ میرے ان کا نام آیا

دیار رسول سے محبت کی جھلک اس شعر میں:

مدینہ میں پہنچ کر قلب مضطر نے اماں پائی
اگرچہ راہ میں میری حرم بھی اک مقام آیا
بتاؤں کیا تمہیں ثاقبؔ ملا کیا نعت گوئی میں
بوقت مرگ اپنے ساقی کوثر کا جام آیا

ایک دوسری نعت میں ان کی پاک تمناؤں کا عکس ملاحظہ ہو:

تمنا ہے کہ گلزار مدینہ اب وطن ہوتا
وہاں کے گلشنوں میں کوئی اپنا بھی چمن ہوتا
بسر اب زندگی اپنی دیار قدس میں ہوتی
وہیں جیتا وہیں مرتا وہیں گوروکفن ہوتا
تمنا ہے کہ کٹتی عمر ان کے آستانے پر
عنایت جلوہ گر ہوتی کرم سایہ فگن ہوتا
خوشا قسمت کہ ہوتا کوچۂ محبوب میں مسکن
یقیں کی راہ میں قربان اپنا جان و تن ہوتا
یہی ہے آرزو ثاقبؔ یہی اپنی تمنا ہے

کہ پیوند بقیع پاک اپنا بھی بدن ہوتا

حضرت کی یہ آرزو بظاہر تو پوری نہ ہوئی، اور وہ ہندوستان ہی کے ایک گاؤں میں دفن ہوئے، لیکن کیا بعید عالم ارواح میں ان کا شمار بقیع پاک کے مدفونین میں ہو، اللھم آمین۔

ان کے دل کا درد اور اندر کا سوز خود انہی کی زبان سے سنئے:

نہیں سمجھا کوئی اس درد کو یہ درد کیسا ہے
دواؤں سے شفا ہر گز نہیں ہر گز نہیں میری
علاج اس کا فقط یہ ہے کہ طیبہ ہو نگاہوں میں
دیار قدس میں اشکوں سے تر ہو آستیں میری
دیار پاک ہوتا اور ہوتی یہ جبیں میری
خدا کی رحمتوں سے زندگی ہوتی حسین میری
متاع درد دل جو مل گئی مشکل سے ملتی ہے
خدا کا فضل ہے حالت تو ایسی تھی نہیں میری
نہ دن میں چین ملتا ہے نہ شب میں نیند آتی ہے
سکوں باقی نہیں ہے خاطر اندوہگیں میری
ہوا پیدا اسی غم کے لئے راحت کا طالب ہوں
طلب کرتا ہوں ایسی شی جو قسمت میں نہیں میری
وہ نقشہ جم گیا ہے اب تو دل میں ذات اقدس کا
تصور میں وہ رہتے ہیں نگاہیں ہوں کہیں میری
ہوا دیوانہ جب سے آپ کا خلوت میں رہتا ہوں
کسی سے بات کرنے کی کوئی خواہش نہیں میری

یہ دنیا دار فانی ہے فقط اک خواب ہے شب کا
جو دیکھا غور سے میں نے تو آنکھیں کھل گئیں میری

ادھر چند برسوں میں ہندوستانی سیاست میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا پیدا ہوئی، بابری مسجد شہید ہوئی اور اسی زمین میں پیدا ہونے والی ایک اقلیت یہیں اجنبی قرار دی گئی، ان حالات پر حضرت ثاقبؔ باندوی کا دل کتنا رویا ہے، اس کی جھلک اس نظم میں دیکھئے:

غلام بن کر جو جی رہے تھے امان دی تھی جنہیں ہمیں نے
صلہ وہ ہم کو یہ دے رہے ہیں ،غلام اپنا بنا رہے ہیں
یہ ظالموں کا ستم تو دیکھ ہمارا پھر بھی کرم تو دیکھ
ہماری آبادی کر کے ویراں ، وہ اپنی بستی بسا رہے ہیں
بچائی تھیں ہم نے جن کی جانیں وہ جن کے بچوں کو ہم نے پالا
وہ خوں ہمارا بہا رہے ہیں ، وہ زندہ بچے جلا رہے ہیں
جنہیں بنایا تھا ہم نے بھائی ، گلے لگایا تھا جن کو ہم نے
بنے ہیں ایسے وہ آج دشمن گلے پر چھریاں چلا رہے ہیں
زمیں ہماری ، چمن ہمارا ، یہاں بہا ہے لہو ہمارا
ستم ظریفی یہ ان کی دیکھو ، چمن وہ اپنا بتا رہے ہیں
ہمارے دشمن ستائیں ہم کو وہ جتنا چاہیں دبائیں ہم کو
خدا نے چاہا وہ روئیں گے کل ، جو آج ہم کو رلا رہے ہیں
نکالنے کو وہ اپنا مطلب کبھی جو کہتے ہیں ہم کو بھائی
ہمارے گھر کے دیئے بجھا کر وہ اپنی شمعیں جلا رہے ہیں
کسی کا اس میں ہے کیا اجارا خدا کے ہم ہیں خدا ہمارا

ستم جو ہم پر ہوئے ہیں اب تک خدا کو اپنے سنا رہے ہیں
وہ میر باقی کی تھی جو مسجد جو عہد بابر کی تھی نشانی
خدا کا وہ گھر یہ ڈھاکے ظالم انوکھا مندر بنا رہے ہیں
کلام پر درد ہے یہ کتنا سنا رہے ہیں ہمیں جو ثاقبؔ
سبھی کو دیکھو رلا رہے ہیں ، وہ خود بھی آنسو بہا رہے ہیں

لمحۂ واپسی

دوسری صبح ہماری روانگی تھی، ہم نے دربار عالیہ میں حاضری دی، اجازت لی، اور بہت سی حسرتوں اور مسرتوں کی دنیا دل میں بسائے وہاں سے رخصت ہو گئے، وادیٔ صدق و صفا میں یہ چوبیس (۲۴) گھنٹوں کا قیام بڑا فرحت بخش، سبق آموز، اور روح پرور رہا، اس کی یادوں کے نقوش میرے صفحہ دل پر ہمیشہ ثبت رہیں گے، ان شاء اللہ۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

مگر افسوس وہ میکدہ تو آج بھی باقی ہے لیکن ساقی نہیں رہا، میرے سفر کو ابھی چالیس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ پروردگار کی طرف سے بلاوا آ گیا، اور وہ میکدہ کو یادگار چھوڑ کر تاریخ کا حصہ بن گئے ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون[14]

---

[14] – تحریر بمقام جامعہ ربانی منورواشریف، بتاریخ ۲۵/ جون ۱۹۹۸ء